اُردو شاعری پر ایک نظر

پُرانی شاعری

کلیم الدّین احمد

اعوان پبلیکیشن ، کراچی

فہرست

مقدمہ	۱-۱۸
۱- تمہید	۱
۲- غزل قطعہ	۲۳
۳- میر- درد- سودا	۷۵
۴- ذوق- غالب، مومن	۱۱۳
۵- قصیدہ- ہجو	۱۵۱
۶- سودا- ذوق	۱۸۹
۷- مثنوی	۲۰۳
۸- میر حسن نسیم بشوق	۲۱۹
۹- مرثیہ	۲۴۱
۱۰- انیس و دبیر	۲۵۷
۱۱- متفرق اصناف	۲۷۱
۱۲- خاتمہ	۲۷۷
ضمیمہ نظیر اکبر آبادی	۱-۴۴

ضمیمہ

اُردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبری آبادی کی ہستی تنہا ستارہ کی طرح درخشاں ہے!

نظیر کا وجود ہی اُردو شاعری کی بے نظر تنقید ہے۔ جب غزل عالم گیر تھی، جب غزل گوئی اور شاعری مترادف الفاظ تھے، ایسے زمانہ میں نظیر نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی اور آزادیٔ فکر کا بیش قیمت نمونہ پیش کیا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نظیر نے غزلیں نہیں لکھیں لیکن انہوں نے غزل کو حاصل شاعری نہیں سمجھا۔ میر، سودا اور غالب کی طرح نظیر کو بھی غیر شعوری طور پر غزل اور شعر مفرد کی تنگ دامانی کا احساس ہوا لیکن انہوں نے چند قطعے لکھ کر اپنی تشفی نہ کر لی اور اپنی شاعری کا زیادہ حصّہ وقف غزل نہ کرتے رہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ مثلث، مخمس اور خصوصاً مسدس میں بھی کام لیا اور ان صنفوں میں اپنے خیالات اور شخصی تجربات کامر بوط و مسلسل بیان کیا۔

میں نے کہا ہے کہ نظیر نے غزلیں بھی لکھیں اور غزل میں بھی انہوں نے نئی راہیں نکالیں۔ غزل کی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں ہر شعر

ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے۔ نظیر نے بہت ساری مسلسل غزلیں لکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے سے گھبراتے ہیں انہیں مربوط و مسلسل کلام میں خاص لطف ملتا ہے۔ اگر دوسرے شعرا کو بھی یہ احساس ہوتا اور وہ نظیر کی نکالی ہوئی راہ پر چلتے تو آج غزل کی دنیا ہی دوسری نظر آتی۔ یوں کہنے کو دوسرے شاعروں نے بھی مسلسل غزلیں اور قطعے لکھے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ شعرا مسلسل غزلیں یا قطعے لکھتے ہیں تو قصداً لکھتے ہیں۔ نظیر کی طبیعت فطری طور پر مربوط و مسلسل کلام کی طرف کھنچتی ہے شاید اسی وجہ سے ان کی غزلوں کی طرف سے بھی بے اعتنائی برتی گئی ہے۔

ہاں تو نظیر نے غزل میں نئی راہیں نکالیں، اس میں نئی وسعتیں پیدا کیں، اس میں نظم کی خوبیاں داخل کیں۔ ان کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

اس غزل کو عام غزلوں سے کوئی مناسبت نہیں۔ اس بے ثباتی دنیا کے مضمون پر نظیر نے کئی غزلیں لکھی ہیں، ہر غزل میں ایک نیا رنگ ہے اور ہر غزل خیالات کے تسلسل کے لحاظ سے نظم کی خوبیاں رکھتی ہے۔ ایک غزل ہے:۔

کیا دل لگاویں مہرباں ہم حسن صورت سے کہیں
نے واں ثبات اس سے ہمیں نے یاں قیام اپنے تئیں
تھا اک مکان دل کش ارشک چمن جس کی فضا
تھی اس جگہ رونق فزا رقاصہ شوخ اک نازنیں
قد حسرت سرو چمن لب غیرت لعل یمن

جعد معنبر پُر شکن نوکِ مژہ نشتر فگن
دیکھ اس کے رقصوں کی ادا اہل رقص ہیں تسے جابجا
نغمات یکسر سحر زا، انداز کل جادو گزیں
نازو ادا کی گرمیاں غارت گرِ صبر و تواں
طورِ تکلّم درفشاں طرزِ تبسم شکریں
کیا کیا لگاوٹ بے بدل کیا کیا رکھاوٹ برمحل
کیا کیا بناوٹ تھیں بہ پل کرتی تھی وہ زہرہ جبیں
گردوں نے اک گردش جو کی نازو عجوزہ ہو گئی
وہ نوجوانی تازگی دیکھی تو کوسوں تک نہیں
وہ گل سا مکھڑا زرد ہے گرمی کا عالم سرد ہے
جاں رنج سے پر درد ہے آزردہ دل اندوہگیں
جوں بید لرزاں دست و پا ہے جائے چوبِ گل عصا
ہر موجو سنبل رشک تھا یکسر ہے برگ یاسمیں
نے چشم میں مستی رہی نے خو میں وہ تندی رہی
نے لب میں وہ سرخی رہی نے منہ میں وہ دُرِّ ثمیں
دیکھ اس کو میں نے ناگہاں پوچھا کچھ اپنا کر بیاں
تھی کل تو رشک گلستاں ہے آج خار مہمگیں
بولی زنظرِ عبرت ہیں رہ گیا پوچھنے کی ہے جگہ
یاں کی یہی ہے رسم و رہ گُل ہے جناں گلا ہے چنیں

دیکھا! اسی پیش پا افتادہ، پامال مضمون میں جدت پیدا کی ہے۔ اس میں واقعیت ہے۔ ایک ڈرامائی شان ہے لیکن اصل

دیکھنا یہ ہے کہ یہ غزل، غزل نہیں بنی ہے۔ اس میں غزل کی پراگندگی و انتشار نہیں ہر شعر جدا گانہ نہیں۔ ہر مضمون ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ایک مضمون دوسرے مضمون سے پیوستہ ہے۔ خیالات کا ایک ڈھانچہ ہے اور سب شعر مل کر اس ڈھانچے کو بناتے ہیں۔ ارتقائے خیال میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں، دشواری نہیں، ناہمواری نہیں۔ اس غزل اور اس قسم کی غزل کے پڑھنے سے جو دماغی اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ عام غزلوں سے نہیں حاصل ہوتا ممکن ہے کہ کسی غزل میں کوئی خاص شعر زیادہ بااثر، زیادہ تیزی اور گہرائی رکھتا ہو لیکن وہ پھر بھی ایک ٹوٹا ہوا موتی ہے۔

اس مضمون پر نظیر نے بہت سی غزلیں لکھی ہیں اور قطعے بھی لیکن وہ صرف اسی ایک مضمون پر اکتفا نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں سراپا بھی لکھا ہے اور ہر بار ایک نئی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظیر کی ایک مشہور غزل ہے جس میں انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں بھی شعر لکھے ہیں۔ اس غزل کا مطلع ہے:-

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا
جھلک وہ مکھڑے میں اس صنم کے کہ جیسے سورج میں ہو اجالا

اسی طرح ایک دوسری غزل میں بھی سراپا لکھا ہے جس کا مطلع ہے:-

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گل رخ و گلگوں قبا و گلعذار و گل بدن

لیکن شاید اس رنگ کی غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور وہ غزل ہے جسے کہتے ہیں کہ نظیر نے میر کے سامنے پڑھا تھا:-

نظر پڑا اک بت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنئے تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو چھیڑ، کسی کو گالی نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا

لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ [illegible]
نظر جو نیچی کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ یہ چلبلاہٹ خبر نہ سر کی نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا بکھرا ابلا سے بکھرا نہ بند باندھا کبھو قبا کا

لگے لپٹنے میں یوں شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا چمک چمک کر، کہیں جو لپکا تو چھپاکا

نہ وہ سنبھالے کسی کے سنبھلے نہ وہ منائے منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے تو غیر کا پھر نہ آشنا کا

یہ رم یہ نفرت یہ دور کھنچنا یہ ننگ عاشق کے دیکھنے سے
جو پتا کھٹکے ہوا سے لگ کر تو سمجھے کھٹکا نگہ کے پا کا

جتا دے الفت چڑھا دے ابرو ادھر لگاوٹ ادھر تغافل
کرے تبسم جھڑپ دے ہر دم روش ہٹیلی چلن دغا کا

نظر ہٹ جا، پرے ہٹ سرک جا، بدل لے صورت چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستم گر تو یار ہوگا ابھی جھگڑا کا

یہ 'سراپا' رسمی قسم کا نہیں جس میں مانگ اور چوٹی سے پا اور فندق پا تک ہر ہر جزو بدن کی رسمی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں واقعیت ہے، نرالی سج دھج ہے اور اک بت پری وش کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

نظیر اپنے خیالی اور ذاتی تجربوں کا اپنی غزلوں میں بیان کرتے ہیں۔ ایک غزل میں زور تخییل کی مدد سے اپنے جوش جنوں کی تصویر کھینچتے ہیں اس غزل کا مطلع ہے:۔

سحر آیا جو نہیں میں کلبۂ احزاں میں بیچارا!
وہیں اک بارگی جوش جنوں نے دل کو للکارا

پھر کافی اہتمام و تکلف کے ساتھ اس للکار کا جو نتیجہ ہوا اسے بیان کرتے ہیں۔ دیر میں ہو پہنچتے ہیں اور بتوں کا پشتارہ باندھ کے بہا گئے ہیں۔ لعبت گرہاں ہاں کہتے رہ جاتے ہیں۔ مسجد میں مصلا پھاڑتے ہیں اور شجرے توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ میکدے میں خم و قرابہ مینا و ساغر کو توڑ کر زمین میکدہ کو مے سے رنگین کرتے ہیں پھر جنگل میں جا نکلتے ہیں تو کبھی فرہاد کو گھیرتے ہیں اور کبھی مجنوں کو جا مارتے ہیں۔ لڑکے پتھر کا مینہ برساتے ہیں۔ فلک کو چکر آتا ہے اور حوریں تماشا دیکھتی ہیں۔ ایک طرف یہ خیالی تصویر ہے تو دوسری طرف اس قسم کی واردات کا بیان ہے۔

بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں
کہ ہم سے یار سے آ ہو گئی مٹھ بھیڑ آندھی میں
جتا کر خاک کا اڑنا، دکھا کر گرد کا چکر!
وہیں ہم لے چلے اس گلبدن کو گھیر آندھی میں

رقیبوں نے جو دیکھا یہ اڑا کے لے چلا اس کو
پکارے: "ہائے یہ کیسا ہوا اندھیر آندھی میں"
وہ دوڑے تو بہت لیکن انہیں آندھی میں کیا سوجھے
نظیر ہم اس پری کو لائے گھر میں گھیر آندھی میں
چڑھا کوٹھے پہ، دروازے کو موندا اور کھول کر پردے
لگا چھاتی، بڑے جی سے، کیا ہت پھیر آندھی میں
اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو!
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں
کبھی بوسہ، کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر!
لگے لٹنے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں
مزے، عیش و طرب، لذت، لگے یوں ٹوٹ کر گرنے
کہ جیسے ٹوٹ کر میووں کے ہو دیں ڈھیر آندھی میں
رقیبوں کی ہیں اب خواری خرابی کیا لکھوں بارے
بھری نتھنوں میں ان کے خاک دس دس سیر آندھی میں
کسی کی اڑ گئی پگڑی، کسی کا پھٹ گیا دامن
گئی ڈھال اور کسی کی گر پڑی شمشیر آندھی میں
نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں، ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

نفس مضمون سے بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غزل میں بھی ایک مسلسل تجربہ کا بیان ممکن ہے اور نظیر نے بار بار مسلسل تجربوں کا بیان اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ایک خیال سے متاثر ہو کر یا کسی خاص زاویہ

نظر کی وجہ سے غزل میں تسلسل خیالات نظر آجاتا ہے یا مضامین میں ایک قسم کی مناسبت و مطابقت پیدا ہو جاتی ہے جیسے غالب کی مشہور غزل میں جس کا مطلع ہے :-

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

یا کبھی کبھار درد کی غزلوں میں۔ نظیر اکثر کسی خاص واقعہ کو اپنی غزل کا مرکز بناتے ہیں۔ سارے اشعار اسی مرکز کے گرد چکر کھاتے ہیں اور آپس میں مل جل کر مربوط تجربہ کا نقشہ تیار کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد ہوس کی یہ غزلیں یادگار ہیں اور گزرے ہوئے واقعات کی آئینہ دار ہیں۔ "ہم سے ملیں" والی غزل یا "ازار بند" والی غزل میں اسی قسم کے واقعات ہیں۔ واقعات اصلی ہوں یا خیالی، وہ عہد ہوس کی یادگار ہوں یا عالم تخیل کے باشندے ہوں، نظیر انہیں غزل کی عام نہج سے الگ ہو کر بیان کرتے ہیں۔ کبھی وہ قاصد کی معرفت خط بھیجتے ہیں تو جب قاصد صحیح سلامت لوٹ آتا ہے تو اس سے پوچھتے ہیں :-

قاصد صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کہا؟
حرف عتاب یا سخن دلکشا کہا؟
تجھ کو قسم ہے کچھ نہ پوشیدہ مجھ سے تو
کہیو وہی جو اس نے مجھے برملا کہا

پھر قاصد کا جواب بیان کرتے ہیں :-

قاصد نے جب تو سن کے کہا "کیا کہوں میں یار
پہلے مجھی کو اس نے بہت ناسزا کہا
پھر تجھ کو سو عتاب سے جھنجھلا کے دم بدم
کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کیا برا کہا!

"اس کا مزہ چکھاؤں گا جا کر اے شتاب
رہ رہ اسی سخن کے تئیں بار ہا کہا
میری تو کچھ خطا نہیں، تو ہی سمجھ اسے
بے جا کہا یہ اس نے مجھے یا بجا کہا
کہتا تھا میں تجھے کہ نہ بھیج اس کو خط میاں
لیکن نظیر تو نے نہ مانا مرا کہا

کبھی قاصد کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے تو کبھی معشوق نظیر کے مکتوب پر اعتراضات کی بوچھار کرتا ہے:-

کل اس کے چہرے کو ہم نے جو آفتاب لکھا
تو اس نے پڑھ کے وہ نامہ بہت شتاب لکھا
جبیں کو مہ جو لکھا تو کہا ہو چلیں بہ چلیں !!
یہ کیسی اس کی سمجھ تھی جو ماہتاب لکھا
چمکتے دانتوں کو گوہر لکھا تو ہنس کے کہا
ستارے اڑ گئے تھے جو در خوش آب لکھا
لکھا جو مشک خط زلف کو تو بل کھا کر
کہا خطا کی جو یہ حرف ناصواب لکھا
گلاب عرق کو لکھا تو بولا ناک چڑھا
اسے نہ عطر میسّر تھا جو گلاب لکھا
جگر کباب لکھا اپنا تو کہا جل کر
بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا
حساب شوق کا دفتر لکھا تو جھنجھلا کر

کہا میں کیا متصدی تھا جو حساب لکھا
جو بے حساب لکھا اشتیاق دل تو کہا
وہ کس حساب میں ہے یہ بھی بے حساب لکھا
ہوئی جو رد و بدل ایسی کتنی بار نظیر
تو اس نے خط کا ہمارے نہ پھر جواب لکھا

اب ایسے معشوق کو کیا کہیے کہ جسے کوئی بات نہیں بھاتی۔ اسے آفتاب کہیے تو عتاب کرتا ہے۔ اور اس کی جبیں کو ماہتاب سے تشبیہ دیجیے تو چیں بہ جبیں ہوتا ہے۔ چمکتے دانتوں کو گوہر کہیے تو ہنس کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے اور زلف کو مشک خطا کہیے تو بل کھانے لگتا ہے۔ عرق کو گلاب کہیے تو ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اگر اپنا حال کہیے تو وہ بھی سنا نہیں جاتا۔ اگر اپنے جگر کو کباب لکھیے تو جل کر کہتا ہے: "بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا"۔ اور حساب شوق کا دفتر دیکھ کر جھنجھلانے لگتا ہے۔ غرض کچھ بھی لکھیے، اس کے حسن کی تعریف یا اپنے عشق کی داستان کچھ بھی اس کو نہیں بھاتا اور آخر نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ خط کا جواب لکھنا بند کر دیتا ہے۔

یہ تو خط و کتابت کا حال تھا۔ کبھی قسمت زیادہ رسائی کرتی ہے تو بالمشافہ گفتگو ہوتی ہے:۔

ایک دن اس مہر خوبی کے حضور — بیٹھ کر ہم نے کہا اے رشک حور
ہم کریں عجز و نیاز و انکسار — تم کرو جور و جفا ناز و غرور
کچھ سبب اس کا بتا جو اس گھڑی — یہ تلعب ہو ہمارے دل سے دور
سن کے فرمایا کہ گل نے باغ میں — کب لیا بلبل کے دل کو کر کے زور
شمع نے بھی کب کہا پروانے کو — یہ کہ تو جل مجھ پہ ہو کر ناصبور

بلبل و پروانہ جب آپ ہی کریں اس میں گل اور شمع کا پھر کیا قصور

عشق میں بوڑھے ہوئے تم بھی نظیر
اب تلک تم میں نہ آیا کچھ شعور

جور و جفا ناز و غرور تو نیر معشوق کا شیوہ ہے لیکن نظیر اس کے دل میں گھر کرتے ہیں اور اس بات کی انہیں خبر بھی ہو جاتی ہے:-

کل سُنا ہم نے یہ کہتا تھا وہ اک ہمراز سے
دیکھتا تھا مجھ کو آج اک شخص عجب انداز سے

وہ نیاز و عجز تھا اس کی نگہ سے آشکار
جس طرح طائر کوئی جا تھک رہے پرواز سے

تو جو واقف ہو تو جا اس کو بلا لا جلدیاں
میں تسلی دوں اسے کچھ شرم سے کچھ ناز سے

ہے مرا دل اس سے ملنے کو نہایت بیقرار
سن کے وہ ہمراز بولا اس بت طناز سے

میں تو اس کو جانتا ہوں نام ہے اسکا نظیر
اور خبر ہے مجھ کو اس کی چاہ کے آغاز سے

تم ہو سادے مہرباں اس کو بکھیڑے یا نہیں
اور سوا اس کے مرا ڈرتا ہے جی غماز سے

سُن کے یہ ہمراز سے اس نے کہا ہنس کر میاں
کچھ بھی ہو ہم تو ملیں گے اس بکھیڑے باز سے

غرض تمام اسی حسن و عشق کی داستان ہے اور خالی خولی داستان نہیں واقعہ ہے جس میں اصلیت ہے اور اسی لئے بیان میں اثر بھی ہے۔

توجانی ہوئی بات ہے کہ معشوق عاشق کا دل چھین لیتے ہیں۔ وہ پردہ نشیں ہو یا بے پردہ سبھوں کا یہی شیوہ ہے اور عاشق اگر دل نہ کھو بیٹھے تو پھر عاشق کہلائے کیسے۔ لیکن دل کے جانے کی جیسی جیتی جاگتی تصویر نظیر نے کھینچی ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کھینچی ہو:-

لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کاجل نے
مرا دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شاداں
لگا ہیں دم بدم سو عیش و عشرت سی لگیں چلنے
کبھی خوش ہو کے ہو ہو کی کبھی بولا اہا ہا ہا
عجب لوٹے مزے اس وقت نظارے کی اٹکا لے
نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری
مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
مجھے کر چل سے غافل بھولی صورت کا بنا نقشہ
کیا اک بار منہ غصے میں سرخ عیار اچپل نے
اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیونکر اپنا جی
اٹھا کر جھٹ قدم واں سے لگا گھر کی طرف چلنے
چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا
اڑا کر مفت نظارے بچا اب تم لگے ٹلنے
ادب سے یوں کہا اب تو ہوئی تقصیر یہ مجھ سے
لگے قطرے پسینے کے مرے منہ سے وہیں ڈھلنے
لگے غمزے لگانے تیر ادھر دکھلا کے سو پھرتی

ادھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے
ادھر آنکھوں کے جادو نے بنا بابا ولا کیا کیا
ادھر کیں پھر تباہی کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے
دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے
وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیر اس شوخ چنچل نے

دیکھا آپ نے! نظیر نے کیسی زندہ تصویر کھینچی ہے۔ نظیر کا اس صنم کو دیکھتے ہی شاداں ہونا اور نظاروں کے مزے لوٹنا، اس صنم کا اس خوش دلی کو دیکھنا لیکن بظاہر کوئی نوٹس نہ لینا۔ پھر یکبارگی غصہ میں منہ سرخ کر لینا۔ نظیر کا گھر کی طرف چلنا اور اس صنم کا ہنس کر کہنا: "اڑا کر مفت نظارے بچا اب تم لگے ملنے" نظیر کا معافی مانگنا اور پسینہ پسینہ ہونا پھر غمزوں، تیغ ابرو اور آنکھوں کے جادو کی یورش اور شوخ چنچل کا نظیر کا دل جھٹ پٹ لے لینا۔ ساری جزئیات سامنے نظر کے گھومنے لگتی ہیں۔ کہیں زبردستی کے یہ نقشے ہیں تو کہیں نظیر دل کی جدائی پر آنسو بہاتے ہیں:-

نظیر آہ دل کی جدائی بری ہے — ہیں کیوں نہ آنکھوں سے آنسو نکالے
اگر دسترس ہو تو کیجئے منادی — کہ پھر کوئی سینے میں دل کو نہ پالے

لیکن نظیر جانتے ہیں سینے میں دل کا ہونا لازمی ہے اور پھر دل کی جدائی بھی لازمی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حسن والے دل لے جائیں گے اسی لئے وہ دل کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ اس سے گلے مل کر روتے ہیں، اس کو سمجھاتے بجھاتے ہیں اور پھر حسینوں سے اس کی سفارش کرتے ہیں یہ سب باتیں کس خوبی سے اس غزل میں بیان کی ہیں:-

میاں دل تجھے لے چلے حسن والے — کہوں اور کیا، جا خدا کے حوالے

ادھر آ ذرا تجھ سے مل کر ہیں رو لوں
تو مجھ سے ذرا مل کے آنسو بہا لے

چلا اب تو ساتھ ان کے تو بے بسی ہے
لگا میرے پہلو میں فرقت کے بھالے

خبردار ان کے سوا زلف و رخ کے
کہیں مت نکلنا اندھیرے اجالے

ترے اور بھی ہیں طلب گار کتنے
مبادا کوئی تجھ کو واں سے اڑا لے

کہیں قہر ایسا نہ کیجو کہ مجھ کو
بلا لے پڑیں فال تعویذ والے

کسی کا تو کچھ بھی نہ جاوے گا لیکن
پڑیں گے مجھے اپنے جینے کے لالے

تری کچھ سفارش بھی ہیں ان سے کر دوں
کرے گا تو کیا یاد مجھ کو بھلا لے

سنو دلبرو! اے گل رخو! مہ جبینو!
میں تم پاس آیا ہوں اک التجا لے

خدا کی رضا یا محبت سے اپنی
پڑا اب تو آ کر تمہارے یہ پالے

تم اپنے ہی قدموں تلے اس کو رکھیو
تسلی دلاسے میں ہر دم سنبھالے

کبھی اس کو تکلیف ایسی نہ دیجو
کہ غم میں یہ رہ کر کرے آہ و نالے

تمہارے یہ سب ناز اٹھاوے گا لیکن
وہی بوجھ رکھیو جسے یہ اٹھا لے

زیادہ کہنے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ظاہر ہے کہ نظیر نے غزل میں بہت سے تجربے کئے اور بہت کامیاب۔ بس ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو
کہا کہ "اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو"

کہا "لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہر دم؟"
کہا کہ "تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو"

کہا "جو حال دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا "غلط ہے یہ باتیں جو تم بناتے ہو"

کہا جتاتے ہو کیوں ہم سے روز ناز و ادا؟
کہا کہ "تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو"

کہا کہ "عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے؟"
کہا "خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو"

کہا کہ "روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا"
کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو"

کہا کہ "ہم نہیں آنے کے یاں" تو اس سے نظیر
کہا کہ "سوچ تو کیا آپ سے تم آتے ہو"

پوری غزل مکالمہ ہے۔ غزل اگر معشوق سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں تو نظیر میں اس قسم کی باتیں بہت ملیں گی۔

جو مثالیں اوپر گذری ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ نظیر غزل میں لکیر کے فقیر نہ بنے اور بندھے ٹکے مضامین کی مروجہ رنگ میں تقلید نہ کی۔ غزل کے میدان میں بھی نظیر کی حیثیت مجتہد کی ہے۔ انہوں نے غزل میں نئے نئے تجربے کئے۔ اس کے امکانات کا جائزہ لیا۔ مضامین اور صورت دونوں میں آزادی اور جدت سے کام لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غزل کی پراگندگی اور انتشار کو دور کرنے کے لئے مختلف صورتیں ایجاد کیں۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ غزل کی صورت برقرار رکھتے ہوئے بھی اس میں نظم لکھی جا سکتی ہے۔ یہ نظیر کا خاص کارنامہ ہے۔ اگر نظیر نظمیں نہ لکھتے تو بھی ان کی یہ "نظمی" غزلیں ان کے اجتہاد اور شاعرانہ عظمت کی زندہ یادگار ہوتیں۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانہ میں جب بنے بنائے رستہ پر چلنا عام شیوہ تھا، جب نئی راہ نکالنے کا خیال بھی کسی کو نہ تھا، جب غزل کے فرسودہ اصول قوانین عالم کی طرح اٹل سمجھے جاتے تھے، ایسے زمانے اور ایسے ماحول میں نظیر نے آزادی خیال کا بے نظیر ثبوت دیا۔ نئے نئے تجربے کئے، نئے نئے سانچے بنائے اور غزل کی ٹکنیک بالکل بدل دی۔ افسوس ہے تو اس پر کہ کسی نے نظیر کی اہمیت کو نہ سمجھا اور ان کے بنائے ہوئے رستے پر چلنے کا خیال بھی نہ کیا۔ اگر غزل گو شعرا نظیر کے تجربوں کی قدر و قیمت کو سمجھتے اور نظیر کو میر کارواں بناتے تو آج اردو شاعری اور اردو غزل اپنی پستی سے نکل کر بہت بلند مقام پر ہوتی۔ زبان اور معیار تغزل کی بھول بھلیاں میں ایسے گم ہوئے کہ کوئی راہ نجات نہ مل سکی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں وہ سب کی سب کامیاب ہیں اور ان میں کوئی خامی یا جھول نہیں۔ لیکن میرا کہنا ہے کہ نظیر نے جو

تجربے کئے وہ قابل غور ہیں اور جہاں اس قسم کے تجربوں کی کمی ہے وہاں نظیر کی کاوشوں کی قیمت کا اندازہ ممکن نہیں۔

ظاہر ہے کہ نظیر نظموں میں بھی اپنے خیالات اور ذاتی تجربات کا مربوط و مسلسل بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں لازمی طور پر ربط و تسلسل کی کاریگری ہے۔ وہ کسی تجربہ کے ٹکڑے پیش نہیں کرتے۔ ان کی ہر نظم پوقلموں جذبات و خیالات کا گلدستہ ہے۔ وہ اجمال کے عوض تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ جزئیات کا خیال رکھتے ہیں بلکہ جزئیات کی نقاشی میں ایک خاص لطف محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کا انہیں اچھا ملکہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ جزئیات میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ مکمل نظم کے حسن کو بھول جاتے ہیں۔ بہرکیف، نظیر نے غزل کو حاصل شاعری نہ سمجھا اور اپنی شاعری کا زیادہ سے زیادہ حصہ وقف غزل نہ کرتے رہے۔ غزل سے زیادہ انہیں نظم نے پکارا اور وہ لبیک کہہ کر اس طرف بڑھے۔ دوسرے شعرا نے اس پکار کو نہ سنا اور اگر سنا بھی تو اس طرف توجہ نہ کی۔ اگر نظیر شاعری کے یہ یادگار کارنامے نہ چھوڑ جاتے، اس حالت میں بھی ان کی ذات آئندہ کے لئے دلیل راہ ہوتی جو آنے والے شعرا کی اچھے اور صحت مند رستہ کی طرف رہنمائی کرتی۔ اگر افسوس ہے تو اس بات کا کہ نظیر کا مطمح نظر بلند نہ تھا اور وہ مغربی ادب سے واقف نہ ہو سکے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس میں نظیر کا قصور نہیں۔ قصور ہے تو اس سماج اور ماحول کا جس میں وہ پلے اور پروان چڑھے۔ اگر مغربی مثالیں نظیر کے سامنے ہوتیں تو وہ اردو شاعری کیلئے زیادہ سے زیادہ بیش قیمت کارنامے چھوڑ جاتے۔ بہرکیف، یہی غنیمت ہے کہ انہوں نے ایسی صنفوں کو چنا جن میں مربوط و مسلسل تجربات و تصورات کی ترجمانی ممکن تھی۔

اردو شاعری کے چند مروجہ مضامین نظیر میں بھی پائے جاتے ہیں۔

صوف کے اثر سے کثرت میں وحدت کی جلوہ آرائی عام مضمون ہو گئی تھی
اس قسم کی مثال نظیر کے کلام میں بھی ملتی ہے :-

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
ہر رنگ میں یا رنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان
ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

موضوع پامال ہے لیکن اس کا بیان نظیر اپنے مخصوص رنگ میں کرتے ہیں وہ عالم کے تماشائی تھے اور اپنی واقفیت کا ثبوت وہ اس نظم میں پیش کرتے ہیں۔ نظیر درد کی طرح آگاہ راز نہ تھے اور دنیا کے تجربات پر ان کا تصرف تھا۔ اس لئے وہ ہر قسم کے تجربے نظم کرتے ہیں، ان کی نظموں میں بوالہوسی بھی ہے اور عشق حقیقی کی بلند اور لطیف کیفیتیں بھی ہاں تو نظیر آگاہ راز نہ تھے لیکن وہ عشق کی بلند و لطیف منزلوں سے واقف تھے :-

ہے چاہ فقط اک دلبر کی پھر اور کسی کی چاہ نہیں
اک راہ اسی سے رکھتے ہیں پھر اور کسی سے راہ نہیں
یاں جتنا رنج و درد ہے ہم ایک سے بھی آگاہ نہیں
کچھ مرنے کا سودا نہیں کچھ جینے کی پرواہ نہیں

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت اسیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

جس سمت نظر بھر دیکھے ہیں اس دلبر کی پھلواری ہے
کہیں سبزی کی ہریالی ہے کہیں پھولوں کی گلکاری ہے
دن رات مگن خوش بیٹھے ہیں اور آس اسی کی بھاری ہے
بس آپ ہی وہ دلداری ہے اور آپ ہی وہ بھنڈاری ہے

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت اسیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

ہم چاکر جس کے حسن کے ہیں وہ دلبر سب سے اعلیٰ ہے
اس نے ہی ہم کو جی بخشا اس نے ہی ہم کو پالا ہے
دل اپنا بھولا بھالا ہے اور عشق بڑا متوالا ہے
کیا کہیے اور نظیر آگے اب کون سمجھنے والا ہے

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت اسیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

نظیر کی ایک نظم ہے "جوگی کا سچا روپ"۔ ان کے دل میں یکایک یہ تمنا ابھرتی ہے کہ جس کی ہر جگہ ثنا خوانی ہو رہی ہے اسے کسی صورت سے دیکھئے۔ وہ جوگی کی شکل بناتے ہیں اور گھر، دوکان، بازار اور کوچہ میں اسے ڈھونڈھتے ہیں جو سامنے آتا ہے اس سے پوچھنے لگتے ہیں: "کہو پیارے ہمارے یار کو تم نے کہیں دیکھا؟" لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ دریا دے حیرت کی طغیانی بڑھتی ہے۔ مسجد، مدرسہ، دیر اور تیرتھوں کی سیر کی لیکن کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر کار جنگل کی راہ لی۔ وہاں بھی پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ نوبت یہ ہوئی کہ

پڑا تھا ریت میں اور دھوپ میں سورج سے جلتا تھا
لگی تھیں دل کی آنکھیں یار سے اور جی نکلتا تھا

اس عالم میں ان کی مشکل آسان ہوتی ہے اور دل کی تمنا پوری ہوتی ہے:-

جب اس احوال کو پہونچا تو وہ محبوب بے پروا
وہیں سو بے قراری سے مری بالیں پہ آ پہونچا
اٹھا کر سر مرا زانو پہ اپنے رکھ کے فرمایا
کہا لے دیکھ لے جو دیکھنا ہے اب مجھے اس جا
عیاں ہیں اس گھڑی کرنے ترے پہ بھید پنہانی
یہ سن رکھ پہلے ہم عاشق کو اپنے آزماتے ہیں
جلاتے ہیں ستاتے ہیں رلاتے ہیں بلاتے ہیں
ہر اک احوال میں جب خوب ثابت اسکو پاتے ہیں
اسی سے آکے ملتے ہیں اسی کو منہ دکھاتے ہیں
اسے پورا سمجھتے ہیں ہم اپنے دھیان کا دھیانی
صدا محبوب کی آئی جونہی کانوں میں وا ئی تیرے
بدن میں آگیا جی اور وہیں دکھ درد سب بھولے
پھر آنکھیں کھول کر دلبر کے منہ پر ٹک نظر کر کے
زمین و آسماں چودہ طبق کے کھل گئے پردے
مٹی اک آن میں سب کچھ خرابی اور پریشانی
ہوئی جب آکے یکتائی دوئی کا اٹھ گیا پردا
جو کچھ وہم و غا تھے اڑ گئے اک دم میں ہو پارا
نظر اس دن سے ہم نے پھر جو دیکھا خوب ہر اک جا

وہی دیکھا وہی سمجھا وہی جانا وہی پایا
برابر ہو گئے ہندو مسلماں گبر و نصرانی

دیکھا! نظیر کیسے بلند مقام تک پہونچے ہیں۔ ان کا یہ کہنا غلط نہیں کہ "زمین و آسماں چودہ طبق کے کھل گئے پردے" ان کی نظروں سے دوئی کا پردا اٹھ گیا تھا۔ تنگ نظری کا کہیں نام و نشان نہیں۔ ان کے لئے "ہندو مسلمان گبر و نصرانی" سب برابر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایکطرف حضرت سلیم چشتی کی مدح میں سرگرم ہوتے ہیں تو دوسری طرف گرو نانک شاہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود، مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نبراہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو "واہ گرو"

اسی طرح کبھی وہ حضرت علی کا معجزہ بیان کرتے ہیں اور کبھی "کشن کنھیا کی بانسری" سن کر جے جے ہری ہری" کہہ اٹھتے ہیں۔ اور جہاں عید و شب برات پر نظمیں لکھتے ہیں وہاں ہولی، دیوالی، بسنت کا رنگین و روشن بیان کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نظیر تنگ دل اور تنگ نظر نہ تھے۔ ان کے دل میں اتنی گنجائش تھی کہ ساری انسانیت اس میں سما سکے۔

میں نے کہا ہے کہ نظیر کی نظموں میں بلند و لطیف عشق بھی ہے اور بوالہوسی بھی۔ ان کی بیشتر نظمیں عشقیہ ہیں یعنی عہد ہوس کی یادگار ہیں۔ اور

مضامین ان نظموں کی جان ہیں وہ محض رسمی نہیں۔ وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان سے بو دے صداقت آتی ہے حسن و عشق سے نظیر واقف تھے اس قسم کی نظموں میں ہوس ناکی غالب ہے جذباتی جوش کم ہے اور پاک بازی نہیں۔ ان میں وہ زور وہ کیفیت نہیں جسے صحیح معنوں میں عشق کہتے ہیں عشق بازی البتہ ہے۔ نظیر کا معشوق پردہ نشین نہیں، بازاری ہے، نہیں" دید بازی" کا چسکا ہے۔ وہ "سو کمر و فن" ہے، سو رنگ و روپ پھر "خوباں کی دید" کرتے ہیں، اسی عاشقی کا دم بھرتے ہیں، اسی عاشقی کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں، اسی عاشقی کی دلفریبیوں میں دنیا کی بے ثباتی مہلت عمر کی کمی کو بھول جاتے ہیں۔

نظیر کی اہمیت یہ ہے کہ وہ مروجہ عشقیہ مضامین کو مروجہ طرز میں نہیں بیان کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذاتی واقعات اور مشاہدات کو اپنے مخصوص رنگ میں منعکس کرتے ہیں۔ جس طرز معاشرت سے وہ آشنا تھے، جس افتاد زندگی کے خوگر تھے، اسی کی حسین نقاشی کرتے ہیں۔ عام اردو شعرا کی طرح ان کی شاعری ماحول سے الگ ہو کر کسی خلا میں سانس نہیں لیتی۔ وہ اپنی نظموں میں اپنے ماحول، اپنے سماج کے نقش و نگار کھینچتے ہیں۔ اسی لئے نظیر میں کوئی شے بھی مصنوعی، فرضی، حقیقت و صداقت سے دور نہیں ہے۔ ہر تفصیل واقعیت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

عالم خواب میں بھی نظیر کی ہوس ناکی نہیں جاتی۔ رات کو وہ بے خبر سو رہے تھے کہ یکایک عالم خواب میں ایک عمارت نظر آتی ہے۔ دروازہ کھلا پا کر وہ اندر چلے جاتے ہیں اور وہاں ایک کافر سا نظر آتی ہے: صورت وہ مہر چاند سا مکھڑا وہ بے بہا اور حسن کا بیان تو ہوتا نہیں ذرا

نقشہ وہ جس کے پاؤں پہ لوٹے پڑی پڑی

اس کے حسن کی تفصیل اس طرح کرتے ہیں:۔

خوں ریز ابرو جان کی قاتل ہر اک نگاہ

مژگاں وہ برچھیوں کو لئے تل رہی سپاہ

مہندی سے انگلیوں نے کئے خون بے گناہ

آنکھوں میں کھینچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ

پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑبڑی

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا

جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا!

گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا

جاتا تھا سرخ جوڑے سے یوں تن یوں جھمک دکھا

گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

یہ کافر ماتقابی ایک بازاری معشوق ہے:۔

چاہت میں اپنی ڈوبا ہوا دیکھا جوں مجھے

ہنس کر لپیٹ گلے سے لگی کہنے یوں مجھے

آ اس محل میں چل کے کریں عیش دو گھڑی

نظیر کی تو یہی عین تمنا تھی مراد پھر کیا تھا ان کی بن آئی:۔

لے کر بغل میں اس کو لگا یا جو ہیں گلے

سو منتوں کے دل پہ مرے کھل گئے درے

حاضر ہوئے جب آن کے سب عیش اور مزے

سینہ سے سینہ مل گیا اور لب سے لب ملے

لوٹے لگی بہار مزوں کی دھڑی دھڑی

اس قسم کے خواب نظیر اکثر دیکھتے ہیں:۔

کل دیکھا خواب عجب ہم نے اک چنچل شوخ پری چھٹا ہے
اک بار گلے سے آلپٹی اور لیٹ پلنگ پر جھٹ پٹا سے
سینہ سے سینہ لگتے ہی دل جوش میں آیا جھٹ پٹا سے
کچھ اور ارادہ تھا دل میں، کم بخت وہ کسی کی آہٹ سے
جب عین مزے کا وقت ہوا جب کھل گئی آنکھ مری پٹ سے

اس شوخ پری کے جوبن کا اک باغ کھلا تھا کیا کہیئے
اور سُرخ بدن میں جوڑا اٹھا اور عطر لگا تھا کیا کہیئے
دیکھ اس کا سینہ حسن بھرا کیا جوش تھا کیا کہیئے
سب دل کی دل کے بیچ رہی کیا عیش نرا تھا کیا کہیئے
جب عین مزے کا وقت ہوا جب کھل گئی آنکھ مری پٹ سے

عالم خواب ہو یا عالم بیداری، نظیر ہمیشہ اسی قسم کی بہار لوٹتے ہیں۔ ہر جگہ انکا معیار یہی ہے کہ کسی شے سے اس عشق بازی میں مدد ملتی ہے یا وہ اس میں مخل ہوتی ہے۔ وہ اسی چیز کی تعریف کرتے ہیں جو ان کے عشقیہ تجربات کو لطیف تر بناتی ہے۔" اندھیری رات ہی کی وہ تعریف کرتے ہیں تو اسلئے کہ وہ عاشق کے بہت کام آتی ہے:۔

بوسہ لیا منہ موڑ الگ ہو رہی چپکے — چھاتی کو لگا چھوڑ الگ ہو رہی چپکے
سینے کا وہ پھل توڑ، الگ ہو رہی چپکے — اغیار کا سر پھوڑ الگ ہو رہی چپکے
اس ڈھب کی تو رکھتی ہے عجب گھات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

آندھی کی بھی وہ ستائش کرتے ہیں تو اسی لئے کہ "ہم سے یار مو آ ہو گئی ڈبھیر آندھی میں"

اس نظم سے صاف ظاہر ہے کہ کسی واقعہ کا بیان ہے۔ یہی واقعیت نظیر کی نظموں کو موثر بناتی ہے۔ "چاندنی" اسی قسم کی پرتاثیر نظم ہے:۔

صحن چمن میں واہ وا زور کھلی تھی چاندنی — چاند ہلور یں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی
آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلا زری — چمکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک نِرّی نِرّی
بوس و کنار و جام و مے عیش و طرب ہنسی خوشی — اس میں کہیں سے یک بیک مرغ سحر نے بانگ دی

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی کی جی میں رہ گئی

شب کو دلوں میں واہ وا زور مزوں کے تار تھے — ہم سے دو چار یار تھا یار سے ہم دو چار تھے
دونوں دلوں میں پیار تھا دونوں گلوں میں ہار تھے — وصل سے بیقرار تھے عیش کے کاروبار تھے
سینے میں آسمان کے تیر حسد کے پار تھے — ایک پلک میں ناگہاں سب وہ مزے شرار تھے

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی کی جی میں رہ گئی

آخری شعر کی ہر بند میں تکرار ایک عجیب اثر پیدا کرتی ہے۔ ترنم میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور عاشق کی حرماں نصیبی کی تصویر دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں چاندنی رات کا دلفریب سماں بھی سامنے گھومنے لگتا ہے۔

نظیر درد کی طرح آگاہ راز نہ ہوں لیکن وہ عشق اور تماشہ بینی کی جملہ کیفیتوں سے واقف تھے۔ بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں ہر رنگ میں وا تھیں۔ وہ دنیا کی بوقلمونی کو دیکھتے تھے اور یہ حیرت انگیز نظارے انہیں محو تحیر رکھتے تھے۔ وہ غور و فکر بھی کرتے تھے اور جو چیزیں وہ دیکھتے تھے ان کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن کامیابی معلوم! نظیر کیا کوئی شخص بھی اس راز سے واقف ہو سکا

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنی ہر ایک اجا تا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس کوئی ہے پنڈت کتھا کہانے
کوئی ہے عاقل کوئی ہے فاضل کوئی نجومی لگا کھلانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

وہ آسمان کی جانب دیکھتے ہیں پھر روے زمین پر نظر دوڑاتے ہیں اور جو ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں اسے وہ اپنے تخیل کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمان کی جانب دیکھتے ہیں :-

ہوا کے اوپر یہ آسماں کا بے چوبا خیمہ جو تن رہا ہے
نہ اسکی میخیں نہ ہیں ... طنابیں نہ اسکی چوبیں ادھر کھڑا ہے
ادھر ہے چاند اور اُدھر ہے سورج ادھر ستارہ ادھر جواہر
کسی کو مطلق خبر نہیں ہے کہ کب بنا اور کاہے کا ہے

پھر زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں :-

فلک تو کہنے کو دور ہے گا زمیں کا اب جو بنا ہوا ہے
کھڑے ہیں لاکھوں پہاڑ جس پر فلک سے سر جس کا جا لگا ہے
ہزاروں حکمت کا اک بچھونا یہ پانی اوپر جو بچھ رہا ہے
بہت حکیموں نے خاک چھانی کوئی نہ سمجھا یہ بھید کیا ہے

اور زمین سے لے کر آسمان تک جو لاکھوں طرح کی خلقت بھری ہے، ہاتھی چیونٹی رائی پربت سبھی کو دیکھتے ہیں ہنسی رونا، شادی غمی، ترقی تنزل، گمان یقین، امید

وزیری، فقیری، وحشی پرندہ کوئی چیز حلقۂ دامِ نظر سے نہیں چھوٹتی وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن کسی چیز کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں اگر وہ کسی راز سے آگاہ ہیں تو وہ بے ثباتیٔ دنیا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی بھی اردو شعرا کا عام موضوع ہے لیکن نظیر نے اس موضوع کو اپنایا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ سب ہیں فانی دہر میں یہ اور اس حقیقت سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خاص و عام، زردار اور مفلس سب لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔ چرخ و چاند، سورج، ستارے کسی کو بقا نہیں:۔

آغاز کسی شے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اس لئے دنیا سے دل لگانا حماقت ہے۔ یہ دھوکے کی ٹٹی ہے:۔

یہ پیٹھ عجب ہے دنیا کی اور کیا کیا جنس اکٹھی ہے
یاں مال کسی کا میٹھا ہے اور چیز کسی کی کھٹی ہے
کچھ پکتا ہے کچھ بھنتا ہے پکوان مٹھائی پٹی ہے
جب دیکھا خوب تو آخر کو نہ چولھا بھاڑ نہ بھٹی ہے
غل شور ہوا آگ ہوا اور کیچڑ پانی مٹی ہے
ہم دیکھ چکے اس دنیا کو یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہے

جب دنیا دھوکے کی ٹٹی ٹھہری تو پھر دنیا کی کسی چیز پر بھی بھروسا نہیں ہو سکتا۔ وہ دولت ہو:۔

دولت جو ترے گھر میں یہ اب پھولی ہے جوں پھول
مردود بھی کرتی ہے یہ اور کرتی ہے مقبول
جو چاہے ترے ساتھ چلے یاں سے یہ مجہول
زنہار خبردار ہو اس بات پہ مت بھول
یہ خندی ترے ساتھ نہیں جائیگی بابا

یا مراتب دنیا ہوں:۔

گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا تو پھر کیا
اور بحر سلطنت کا گوہر ہوا تو پھر کیا

ماہی، علم، مراتب پُر زر ہوا تو پھر کیا
نوبت، نشاں، نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا

سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا

نتیجہ معلوم!

تھا ایک دن، وہ دھوم کا نکلا تھا جب سوار ہو
ہر دم پکارے تھا نقیب آگے بڑھو پیچھے رہو

یا ایک دن دیکھا اسے تنہا پڑا پھرتا ہے وہ
بس کیا خوشی کیا ناخوشی یکساں ہے ساری دوستو

گر یوں ہوا تو کیا ہوا گر دوں ہوا تو کیا ہوا

دولت اور مراتب دنیا کو تو خیر سب جانتے ہیں کہ ہیچ ہیں۔ علم و فضل کا بھی یہی حال ہے:۔

پڑھ علم کئی اس دنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے
اور لاد کتابیں اونٹوں پر ہر معنی کے دڑاک ہوئے

معقول پڑھی منقول پڑھی ہر منطق میں چالاک ہوئے
یاں جتنے علم کے دریا ہیں ان دریا کے پیراک ہوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

اس لئے نظیر غافلوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ انجام کو نہ بھولیں۔ دنیا کی دلفریبیاں دل کی کشش کریں، لیکن نشاط فراموشی کا پیغام دے، علوم و فنون اپنی طرف کھینچیں عشق و حسن کے راز و نیاز منہمک رکھیں لیکن انسان کو کسی حال میں بھی غفلت روا نہیں:۔

جہاں ہے جب تلک یاں سینکڑوں شادی و غم ہوں گے
ہزاروں عاشق جانباز اور لاکھوں صنم ہوں گے
کنار و بوس اور عیش و طرب بھی دمبدم ہوں گے
مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہوں گے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

نظیر بے ثباتی دنیا کے نظارہ سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ وہ بار بار تنبیہ کرتے ہیں۔ ہر مرتبہ نئے رنگ سے اس لئے تکرار سے بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔ بعض نظمیں اس موضوع پر بے حد موثر ہیں اور اردو شاعری میں انکی مثال نہیں۔ "بنجارہ نامہ" اسی قسم کی ایک نایاب اور پُر اثر نظم ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئی پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر بند میں پانچویں مصرع کی تکرار دل پر ایک عجیب اثر پیدا کرتی ہے۔ اس تکرار سے فنا کی شکل دل میں نقش ہو جاتی ہے۔ یہی اثر، سحر آفریں اثر اس نظم میں مستور ہے جس کا پہلا بند ہے۔

بٹ مار اجل کا آپہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے لے پس من مار مرو بابا

جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا!

مضمون پامال سہی لیکن نظیر اس پر رسمیہ طور پر نہیں لکھتے۔ اس خیال نے جذبات کو ابھارا ہے اور تخیل میں طوفان برپا کیا ہے اسی لئے ہر ہر شعر بلکہ ہر ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر ہر لفظ مصور ہے۔ یہ نظمیں تصویروں سے بھری پڑی ہیں، ایسی تصویریں جو ان کے دیدۂ بینا نے دیکھی تھیں، ہر تصویر اصلیت و صداقت سے لبریز ہے:-

سر کا پا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں
قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیائی گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں
جو ہونی تھی سو ہو گذری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ نظیر کی جدت ہے کہ ایک پامال موضوع کو اپنے مخصوص رنگ میں کمال حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بے ثباتیٔ دنیا کا بیان میر نے بھی اپنے مخصوص رنگ میں مؤثر پیرایہ میں کیا ہے لیکن نظیر ایک الگ رستہ اختیار کر لیتے ہیں بے ثباتیٔ دنیا کا تصور ان کے دماغ میں دو طرح کی لہریں پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ دنیائے دوں کی مذمت کرتے ہیں، قناعت کی ہر حال میں تلقین کرتے ہیں اور نیک عمل کی طرف بلاتے ہیں۔ دوسری لہر یہ اٹھتی ہے کہ مہلت اگر کم ہے، حسین و جمیل چیزیں دیرپا نہیں اس لئے " دیکھ لے دنیا کو غافل یہ تماشے پھر کہاں "

دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے یہاں قناعت ضروری ہے:۔

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں — ہر کام میں ہر دام میں ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں — بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

چہرے پہ ملامت نہ جگر میں اثر غم — ماتھے پہ کہیں چین نہ ابرو میں کہیں خم
شکوہ نہ زباں پر نہ کبھی چشم ہوئی نم — غم میں بھی وہی عیش الم میں بھی وہی دم
ہر بات ہر اوقات ہر افعال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

پھر دنیا دار المکافات بھی ہے۔ نظیر کو یقین ہے کہ "گندم از گندم بروید جو ز جو" اس لیے وہ کہتے ہیں:۔

ہے دنیا جس کا ناؤں میاں یہ اور طرح کی بستی ہے
جو مہنگوں کو تو مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
یاں ہر دم جھگڑے اٹھتے ہیں ہر آن عدالت بستی ہے
گر مست کرے تو مستی ہے اور پست کرے تو پستی ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں ... انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

اس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ "یاں جیسی جیسی کرنی ہے پھر ویسی ویسی بھرنی ہے":۔

جو اور کا اونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے

بے ظلم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں :-

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے
کر چک جو کچھ کرنا ہو اب یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تہمت میں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

خیال کی ایک لہر یہ ہے اور دوسری لہر یہ اٹھتی ہے : چمن دہر میں خزاں آنے والی ہے اس لئے سیر گلزار جہاں دیکھ لے۔ اور اگر خزاں نہ بھی آئے تو فرصت ہستی پھر کہاں :-

دیکھ تک غافل چمن میں گلفشانی پھر کہاں
یہ بہار عیش یہ شور جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب شراب ارغوانی پھر کہاں
عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

اب جو آغاز جوانی کی بہاریں ہیں میاں — عیش و عشرت میں اڑالے زندگی کی خوبیاں
نشہ پی کر کوئی دم کرلے تو سیر بوستاں — واعظ و ناصح بکیں تو انکے کہنے کو نہ مان

دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

دنیا میں حسن کا چشمہ رواں ہے۔ شاعر کی حسن دوست نگاہیں بھر کیوں نہ اس نظارہ سے لطف و سرور حاصل کریں۔ نظیر اسی حسین نظارہ میں منہمک ہیں، اور دوسروں کو بھی دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ چشمہ ٹھہرتا نہیں۔ یہ ہمیشہ رواں ہے لیکن یہ کبھی یک قلم گذر نہیں جاتا۔ اسی وجہ سے وہ ہر لمحہ اس سیر میں غرق رہتے ہیں اور ان گذر جانے والی حسین چیزوں پر آخری نگاہ ڈالتے ہیں۔ اسی احساس کی وجہ سے ان کی نظموں میں ایک مخصوص حسرت آمیز درد ملتا ہے۔ حسن کی دلفریبی اور اس کی بے ثباتی دونوں کا انہیں بیک وقت احساس ہے اپنے معشوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

آج تجھ کو حق نے دی ہے حسن و خوبی کی بہار — چاہنے والوں سے کر لے کچھ سلوک مہر و پیار
کوندتا بجلی کا اور جوبن کا مت گن اعتبار — کاٹھ کی ہانڈی نہیں چڑھتی ہے پیارے بار بار

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اب تو منہ گل ہے پیارے پھر دھتورا رکھ ہے — آج یہ گلشن کھلا ہے کل کو سوکھا ساکھ ہے
جو اٹھا شعلہ بھبو کا آخرش کو راکھ ہے — چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیرا پاکھ ہے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اس مشورہ پر نظیر خود بھی عمل کرتے ہیں۔ قناعت ان کا شیوہ ہے۔ جاہ و منصب کی انہیں ہوس نہیں۔ دولت دنیا کی انہیں خواہش نہیں۔ وہ ان سب

چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور جس قناعت کی تلقین کرتے ہیں اسی کو اپنا مسلک قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا سے قطع تعلق نہیں کرتے۔ دنیا کے حسن سے متاثر ہوتے ہیں اور حسن کی بے ثباتی اور اپنی اجل نصیبی کا خیال کر کے وہ اپنی فرصت عمر حسن و عشق کی بہار لوٹنے میں صرف کرتے ہیں۔

میں نے گذرے ہوئے صفحوں میں کوشش کی ہے کہ نظیر کے چند اہم خیالات اُجاگر ہو جائیں۔ لیکن نظیر کے خیالات اور تجربوں کی دنیا ایسی وسیع ہے کہ وہ مختصر سے پیمانہ میں نہیں سما سکتی۔ پھر بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات میں تضاد ہے۔ ایک طرف وہ ایسے عشق کا ذکر کرتے ہیں جو رفعتوں کا حامل ہے اور دوسری جانب بوالہوسی اپنا شعار بناتے ہیں۔ کبھی ان کا دربار سب سے اعلیٰ ہے اور کبھی وہ بازاری معشوق ہے کبھی وہ اعلیٰ اخلاقی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں تو کبھی شہدوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی فقر و قناعت، ترک دنیا کی تلقین کرتے ہیں تو کبھی حسن و عشق کی بہار لوٹتے ہیں منہمک نظر آتے ہیں اور اپیکورس کے فلسفہ کو اپناتے ہیں۔ یہ سب سہی لیکن نظیر کے خیالات میں کوئی تضاد نہیں انکا خیالات و تجربات کی دنیا پر تصرف ہے۔ ایلیٹ نے کہا ہے شاعر اپنے انسانی جذبات سے کام لیتا ہے اور یہ جذبات خام مواد کا کام دیتے ہیں جنہیں وہ فنی کارنامے کی شکل عطا کرتا ہے۔ نظیر بھی ہر قسم کے خیال اور تجربے کو اپنا خام مواد سمجھتے ہیں اور انہیں فنی کارناموں کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے ان نظموں میں بوقلمونی ہے مثلاً ایک نظم ہے "آدمی کی فلاسفی" جس کا پہلا بند ہے:۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس نظم میں ایک اور بند ہے :-

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے جو دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی خیالات کا کچھ پرتو ہے، وہ خیالات جو انقلاب فرانس کا سبب ہوئے اور جن کی اس انقلاب نے ترویج کی۔ ان شعروں سے بعض برنس اور ورڈزورتھ کی نظموں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک نظم ہے "روٹی کی خلاصی" جس کا ایک بند ہے :-

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

ایک اور دوسری نظم میں کہتے ہیں :-

جب ملی روٹی ہمیں سب نور حق روشن ہوئے
رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے
اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

ممکن ہے لوگ کہیں کہ نظیر اشتراکی خیالات سے واقف تھے کہ آدمی کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور یہی وہ بنیادی قدر ہے جس پر ساری قدروں کا انحصار ہے۔ اگر روٹی نہ ہو تو پھر اخلاق، فلسفہ، علوم و فنون، مذہب کچھ نہ ہو۔

زندگی کے نظم و نسق اسی سے وابستہ ہیں۔ لیکن نظیر نہ تو اشتراکی تھے اور نہ انقلاب فرانس کے بانی۔ وہ تو ہر قسم کے خیالات کو جو ان کے زمانہ میں فضا میں بکھرے ہوئے تھے اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کا دام حلقۂ خیال بہت وسیع تھا، اس لئے ہر قسم کی چیزیں پہنچ آتی ہیں۔

نظیر کا موضوع ہے انسان اور انسانی دنیا کے مختلف مناظر۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ فطرت کے حسن سے باخبر نہ تھے۔ لیکن وہ کبھی صرف فطرتی مناظر کی تصویر کشی نہیں کرتے۔ فطرت کی اہمیت ان کی نظموں میں ثقفی زمین کی ہے۔ اگر وہ چاندنی کی رات کا بیان کرتے ہیں "چاند ہلور ہیں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی"، تو اس لئے کہ وہ اس دل کش پس منظر کے سامنے اپنے "عیش کے کاروبار" کی دلچسپ تصویر پیش کر سکیں۔ اگر وہ بہار کی چمن منڈری کا رنگین بیان کرتے ہیں تو اس لئے کہ بہار کی رنگینی سے ان کی انجمن عیش کی تزئین ہو:۔

شب کو چمن میں واہ وا کیا ہی بہار تھی مچی
پھول کھلے تھے پھول پھول غنچہ کھلے کلی کلی

بیلا چنبیلی رائے بیل موتیا جو ہی سیوتی
باد صبا کی چلتی تھی عطر و گلاب میں بسی

حوض پڑے چھلکتے تھے نہریں ہلوریں لیتی تھیں
شوخ بغل میں غنچہ لب ساتھ ہے کے نشہ کی تازگی

عیش و طرب کی لہر میں رات جب آدھی ڈھل گئی
اس میں کہیں ہوا ہے غضب نکلی جو مکہ چاندنی

صبح کے ڈر سے سٹپٹا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی درغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

اگر وہ بہار کی جھڑی، ابر و ہوا کی دھوم کا سماں دکھاتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی شب عیش کو اجاگر کر سکیں:۔

چار طرف ابر کی واہ اٹھی تھی کیا گھٹا
بجلی کی جگمگاہٹیں، رعد رہا تھا گڑگڑا

برسے تھا مینہ بھی جھوم جھوم چھاجوں امنڈ پڑا
جھونکے ہوا کے چل رہے یار بغل میں لوٹتا
ہم بھی ہوا کی لہر میں پیتے تھے مے بڑھا بڑھا
دیکھ ہمیں اس عیش میں سینہ فلک کا پھٹ گیا

ابر کھلا، ہوا گھٹی بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہہ گئی

ظاہر ہے کہ یہاں دلچسپی کا مرکز عیش کا کاروبار ہے فطری مناظر نہیں۔ نظیر زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مختلف رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ کبھی وہ طفلی کے بھولے بھالے پن سے پردا اٹھاتے ہیں تو کبھی لطف شباب کا رنگین بیان کرتے ہیں:-

ہنس ہنس کے کوئی حسن کی چھل بل ہے دکھاتی — مستی کوئی سرمہ کوئی کاجل ہے دکھاتی
چتون کی لگاوٹ کوئی چنچل ہے دکھاتی — کرتی کوئی انگیا کوئی آنچل ہے دکھاتی

کہتی ہے کوئی رات ہے پاس نہ آئے — کہتی ہے کوئی ہم کو بھی خاطر میں نہ لائے
کہتی ہے کوئی کس نے تمہیں پان کھلائے — کہتی ہے کوئی گھر کو جو جائے ہمیں کھائے

اور پھر عالم پیری میں جو کایا پلٹ ہو جاتی ہے اس کی تصویر کشی کرتے ہیں؛ "عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا" بوڑھے ہوئے تو بھی خوباں کی دید، کا چسکا نہیں جاتا پھر نتیجہ معلوم۔

خوباں میں اگر جاویں تو ہوتی ہے یہ پھکڑی — کھینچے ہے کوئی ہاتھ کوئی پکڑے ہے لکڑی
مونچھیں کہیں تتی کے بنے جاتی ہیں پکڑی — داڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

کہتا ہے کوئی چھین لو اس بوڑھے کی لاٹھی — کہتا ہے کوئی شوخ کہاں کھینچ لو داڑھی

اتنی کسی کافر کو سمجھ اب نہیں آتی　　کیا بوڑھے جو ہوتے ہیں تو کیا ان کے نہیں جی

گر جائیں طوائف میں تو لگتی ہے سنانے　　کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے　　ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے
غرض ہر طرف نصیحت ہی نصیحت ہے اور کیوں نہ ہو "جب بوڑھے ہوئے پر حسن کی چاہت نہیں چھٹتی"

میں نے کہا ہے کہ نظیر کا موضوع تھا انسان اور انسانی دنیا کے مختلف مناظر۔ لیکن وہ فطرت کے حسین و بوقلموں مناظر سے بھی باخبر تھے اور ان کی حسین، صاف اور موثر عکاسی بھی کر سکتے تھے۔ چاندنی رات کی سیم گونی، بہار کی گل فشانی خصوصاً برسات کی بہاریں نہایت پر لطف طریقہ سے بیان کی گئی ہیں:۔

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں　　جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں　　گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی ہوائیں

جنگل سب اپنے تن پر سبزی سجا رہے ہیں　　گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں　　اللہ کے نقارے نوبت سے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی ہوائیں

اسی کامیابی کے ساتھ وہ "اس" کا بھی بیان کرتے ہیں اور موسم زمستان کے نقش و نگار کھینچتے ہیں:۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

پالا برف پگھلتا ہو تب بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ان نظموں کی بھی وہی اہمیت ہے کہ ان میں دیکھی ہوئی چیزوں کی نقاشی ہے۔ یہاں قصداً مناظر فطرت کی خیالی، رنگین و مرصع تصویریں نہیں۔ البتہ جن مناظر سے نظیر واقف تھے، جن فطرت کی تصویروں نے ان کے تخیل کو ٹھکایا تھا بس انہیں کا صاف، حسین اور دلکش بیان ہے۔ جزئیات کا خیال ہے اور معمولی چیزوں سے بھی غفلت نہیں برتی گئی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ ان مناظر سے عقبی زمین کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً جاڑے کی بہاریں دکھلاتے ہیں تو اس لئے کہ پیش نظر ہیں وہ یہ سین پیش کر سکیں:۔

ہو فرش بچھا غالیچوں کا در پردے چھوٹے ہوں آکر
اک گرم انگیٹھی جلتی ہو اور شمع ہو روشن تس پر
وہ دلبر شوخ پری چنچل ہے دھوم مچی جس کی گھر گھر
ریشم کی نرم نہالی پر سو ناز و ادا سے ہنس ہنس کر
پہلو کے بیچ مچلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ترکیب بنی ہو مجلس کی اور کافر ناچنے والے ہوں
مُنہ ان کے چاند کے ٹکڑے ہوں تن انکے روئی کے گالے ہوں
پوشاکیں نازک رنگوں کی اور اوڑھے شال دوشالے ہوں
کچھ ناچ اور رنگ کی دھومیں ہوں کچھ عیش کی ہم متوالے ہوں
پیالے پر پیالہ چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اسی طرح "برسات کی بہاریں" بھی کامیاب اور متنوع تصویروں سے بھری پڑی ہے نظم کیا ہے تصویروں کا البم ہے۔ کہیں پانی کا یہ زور کہ:۔

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا — گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا — باقی تھا اک اسارا سو وہ بھی آن ٹپکا

تو کہیں کیچڑ کا یہ عالم کہ:-

گر گر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر — پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر — ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر

کسی جگہ عیش و طرب کے سامان ہیں:-

کتنے شراب پی کر ہو مست جھک رہے ہیں — مے کی گلابی آگے پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر گھنگھرو چھنک رہے ہیں — پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ طبلے گھمک رہے ہیں

تو کہیں "برہنوں" کا یہ حال ہے:-

جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سناتی — سنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے اُمڈی آتی
پی پی کی دھن کو سن کر بیکل ہی ہیں کہتی جاتی — مت بول اے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی

غرض مختلف قسم کی تصویریں ہیں اور کیسی کامیاب! ہر تصویر میں حقیقت کی جھلک ہے۔ ان میں سے کوئی بھی فرضی و خیالی نہیں۔ نظیرؔ حقیقت طراز شاعر ہیں، جو چیزیں وہ گردوپیش میں دیکھتے ہیں ان کی جیتی جاگتی تصویریں اتارتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں خاص ہندوستان کی فضا میں سانس لیتی ہیں ان میں ذرا بھی اجنبیت کی بو نہیں۔ اس قسم کی نظمیں اردو میں نایاب ہیں۔ یہی حقیقت طرازی ان نظموں میں بھی ملتی ہے جن میں عید، شب برات، دیوالی، ہولی کے نقش و نگار کھینچے گئے ہیں۔ ہولی کی رنگینی سے نظیرؔ خاص طور سے متاثر ہوتے ہیں اس لئے بار بار ہولی کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں:-

ہر جا گہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے

ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
مُنہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی میں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ آگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں:-

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے رنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے مُنہ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

میں نے نظیر کی شاعری کے چند اہم پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن سے نظیر کی اہمیت کا اندازہ ممکن ہے۔ تعجب ہے کہ نظیر کی شاعری کی طرف سے عموماً بے اعتنائی برتی گئی ہے اور بہت کم لوگوں نے ان کی شاعری کے محاسن کو سمجھا اور ان کا اعتراف کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو میں زبان کو شاعری پر ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے اور کہا جاتا ہے کہ نظیر کے شعر زبان کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ زبان کا تحفظ، اسکی پاکیزگی کا خیال، فصاحت کا التزام یہ سب چیزیں بُری نہیں لیکن اُردو شعرا زبان کو بت بنا کر اس کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ اسی طرز خیال کی وجہ

سے اردو شاعری میں بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں

بات یہ ہے کہ زبان کوئی اچھوتی، حسین دیوی نہیں جس کی پوجا کی جائے۔ یہ تو صرف ایک ذریعہ، ایک آلہ ہے جس سے جذبات و خیالات کی ترجمانی ممکن ہے جذبات و خیالات سے الگ اس کی کوئی خاص وقعت اور اہمیت نہیں اردو شعرا لفظوں کی الٹ پھیر کو شاعری سمجھتے رہے ہیں۔ نظیر کا زاویۂ نظر جداگانہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے تجربوں کو مکمل، موزوں، رواں اور مؤثر طریقے سے پڑھنے والے تک پہنچا سکیں۔ ان کے ہاتھ میں زبان ایک لچکیلی سی چیز ہے جس کو وہ اپنے تجربوں کی نوعیت کے لحاظ سے مناسب و موزوں سانچے میں ڈھالتے ہیں اور جس سے وہ نئی نئی شکلیں بناتے ہیں۔ وہ کبھی یہ غلطی نہیں کرتے کہ زبان کی فصاحت اور پاکیزگی کے موہوم حسن پر اپنے تجربوں کی لطافت کو نثار کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان غیر فصیح سمجھی جاتی ہے۔ جن لفظوں کا استعمال نظیر اپنی بول چال میں کرتے تھے اور جو ان کے گرد و پیش استعمال ہوتے تھے انہیں لفظوں سے نظیر اپنی نظموں میں کام لیتے ہیں۔ اور وہ ہندی کے الفاظ بھی بہ کثرت اور بے تکلف نظم کرتے ہیں۔ یہ باتیں فصحا روا نہیں رکھ سکتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن تجربوں اور واقعوں اور جس طرز معاشرت کا نظیر بیان کرتے ہیں ان کا کسی دوسرے رنگ میں کامیاب بیان ممکن نہ تھا۔

الفاظ اور تجربات میں جو ناگزیر تعلق ہے اس سے لوگ عموماً واقف نہیں ہمارے جو تجربے ہوتے رہتے ہیں، جن خیالات کی لہریں ہمارے دماغ میں اٹھتی رہتی ہیں، جو اثرات ہماری قوت حاسہ قبول کرتی رہتی ہے، ان سب چیزوں کو ہم اپنے حافظہ میں الفاظ کی مدد سے محفوظ رکھتے ہیں اور فطری طور پر ہم انہیں لفظوں کا غیر شعوری استعمال کرتے ہیں جنہیں ہم اپنی بول چال میں کام

لاتے ہیں، جب ہم کسی خاص جذبہ سے مجبور ہو کر اپنے تجربوں کو شعری سانچہ میں ڈھالنے لگتے ہیں تو ہمارے تجربے، ہمارے خیالات، ہمارے احساسات انہیں الفاظ کا جامہ پہن کر سامنے آتے ہیں۔ اگر ہم فصاحت یا زبان کی پاکیزگی کے خیال سے ان لفظوں کو جو ہمارے تحت الشعور سے ابھرتے ہیں فصیح و پاکیزہ لفظوں سے بدل دیں تو شاید فصاحت تو ہاتھ آجائے لیکن اثر زائل ہو جائے گا۔ نظیر اس قسم کی غلطی نہیں کرتے اسی وجہ سے ان کے اشعار اس قدر پُر اثر ہیں۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی شاعر میں اصلیت ہے، اگر اس کی خاص شخصیت ہے، اگر اس کے تجربے کسی خاص رنگ میں رنگے ہوئے ہیں تو وہ اپنی زبان آپ بنا سکتا ہے، شاعر زبان کا بندہ نہیں زبان اس کی محکوم ہے۔ اگر اس میں ایجاد کا مادہ ہے، تو وہ اپنے نایاب تجربوں کے لئے زبان کے نئے نئے سانچے بنا سکتا ہے اور یہ سانچے عام قواعد و معیار فصاحت کے نہیں، خود زائیدہ قواعد کی پابند ہو سکتی ہے۔ نظیر اسی قسم کے مجتہد شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی الگ زبان کی ایجاد کی ہے۔ ایسے مجتہد شاعر کو صرف ایک بات کا لحاظ چاہیے اور وہ یہ کہ جو زبان اس نے بنائی ہو اس کی بنا اس کے روزمرہ پر ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ کھوج کھوج کے ایسے غیر معمولی، دشوار، ثقیل، نامانوس الفاظ کو اکٹھا کرے جو کبھی گفتگو میں مستعمل نہ ہوتے ہوں اور جن سے وہ اپنے تفکر و تصور میں مدد نہ لیتا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی شاعری ایک عجوبۂ روزگار سے زیادہ وقعت نہ رکھے گی۔ نظیر کبھی ایسا نہیں کرتے۔

نظیر نے جتنے لفظوں کا استعمال کیا ہے، اردو کے کسی شاعر نے نہیں کیا۔ یہ بات بھی نظیر کی شاعرانہ عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ الفاظ خلا میں سانس نہیں لیتے۔ ہر لفظ احساسات و خیالات کی ایک دنیا ہوتا ہے۔ اور

اچھا شاعر لفظ کی گنجائشوں سے معرفت لیتا ہے۔ ان لفظوں کی وجہ سے نظیرؔ کی نظموں کے احساسات و تصورات کی دنیا وسیع، رنگین وزریں اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ہر طرح کے ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت سے لئے گئے ہیں اور مل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نظیرؔ کے الفاظ پر ریسرچ کیا جائے۔ اور یہ ریسرچ صرف الفاظ ہی تک محدود نہ رہے بلکہ جو استعارے تشبیہیں، نقوش نظیرؔ نے استعمال کئے ہیں ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ یہاں بھی وہی رنگینی وزرینی، وہی جدت و پیچیدگی ملے گی اور نظیرؔ کی عظمت کا نقش اور محکم ہو جائیگا

نظیرؔ میں چند خامیاں بھی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شاعری کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ ان کی شخصیت معمولی تھی اور ذہنیت بہت اعلیٰ پیمانہ کی نہ تھی وہ اپنے ماحول سے متاثر نہ ہوئے لیکن اس پر ناقدانہ نظر نہ ڈالی۔ اگر وہ اپنے ماحول، اس طرز معاشرت کی جس سے وہ واقف تھے، الگ تھلگ رہ کر تصویر کھینچتے تو بہترین حقیقت طراز شاعر ہوتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیرؔ اپنے ماحول میں جذب ہو جاتے اور گرد و پیش کی زندگی میں کوئی خامی نہیں پاتے۔ اس زندگی کی غرض و غایت عامیانہ پہلو لئے ہوئے ہے اسوجہ سے ان کی نظموں سے کامل سکون نہیں ملتا۔

پھر ایک خامی اور بھی ہے جو ان کے تخیل سے وابستہ ہے۔ وہ دیدۂ بینا تو رکھتے ہیں خصوصاً گرد و پیش کی چیزوں کو نہایت صفائی اور کامیابی کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن ان کے تخیل کو طاقت پرواز نہیں اور یہ طاقت بھی نہیں کہ وہ جذبات و خیالات کی آلائشوں کو دور کر سکے اور انہیں خامیوں اور نقائص سے پاک کر سکے یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ان کی نظموں میں جذبات محض خیالات محض ملتے ہیں جو تخیل تجربہ کی شکل میں تبدیل نہیں ہو سکے ہیں

ان کی ٹکنیک میں بھی بہت کچھ کمی اور جھول ہے۔ ان کی نظمیں طو
ہوتی ہیں اور دوسرے شاعروں کی طرح وہ بھی اکثر ایک بند کے بع
بند لکھے جاتے ہیں اور توازن کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کی بہت سی نظمو
اگر کوئی بند نکال دیئے جائیں تو ان کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ ہو جا
گا اور مضمون میں کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ پھر ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ
ان کی نظمیں وہی اثر پیدا کرتی ہیں جو کسی مربوط غزل میں ہوتا ہے، یعنی
نظمیں کسی خاص موضوع پر تو ہوتی ہیں اور مختلف بندوں میں ربط بھی ہو
ہے لیکن ارتقائے خیالات و جذبات کا وجود نہیں ہوتا۔ اور ایک
بات یہ بھی ہے کہ اکثر نظر اپنے جذبات و تصورات کی ترجمانی میں کاو
سے کام نہیں لیتے۔ کہ بہترین الفاظ و نقوش تجویز نہیں کرتے
اور کبھی کبھی غیر ضروری الفاظ و نقوش کی بھرمار بھی کرتے ہیں جس
سے نظم کے حسن میں کمی ہو جاتی ہے۔